ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3906

Program: BS Islamic Studies (Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: سیرت النبی ﷺ کا موضوعاتی مطالعہ (سیاسی اور بین الاقوامی پہلو) (3906) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ 1–4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: جزیرہ عرب کی حدود، قبل از اسلام حکومتیں اور سیاسی نظام کا تقابلی جائزہ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: جزیرہ عرب کی حدود بیان کریں۔ اسلام سے قبل اس خطے میں قائم اہم حکومتوں کا مختصر تعارف لکھیں۔ نیز اس خطے میں قبل از اسلام اور موجودہ دور کے سیاسی نظام اور طرزِ حکمرانی کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔ (20)

تعارف

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی پہلو کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اس خطے کو سمجھنا ضروری ہے جہاں اسلام ظاہر ہوا، یعنی جزیرہ عرب۔ جس ماحول میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، پرورش اور دعوت کا آغاز ہوا، اس کی جغرافیائی ساخت، اس کی سیاسی تقسیم اور اس کے نظامِ حکومت نے بعد کے واقعات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اگر طالب علم کو یہ معلوم نہ ہو کہ عرب میں کوئی مرکزی حکومت موجود نہیں تھی، قبائل ہی اصل سیاسی اکائیاں تھیں اور شمال و جنوب میں بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کے زیرِ اثر ریاستیں قائم تھیں، تو وہ نہ مکہ کی سیاست سمجھ سکتا ہے، نہ مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کی انقلابی اہمیت جان سکتا ہے۔ اس جواب میں پہلے جزیرہ عرب کی حدود بیان کی جائیں گی، پھر اسلام سے قبل کی اہم حکومتوں کا مختصر تعارف پیش کیا جائے گا اور آخر میں قبل از اسلام اور معاصر دور کے سیاسی نظام اور طرزِ حکمرانی کا تقابلی جائزہ دیا جائے گا۔ یہ بحث خالصتاً تاریخی اور تعلیمی ہے۔

جزیرہ عرب کی حدود

جزیرہ عرب دنیا کے بڑے جزیرہ نماؤں میں سے ہے اور ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کے تین اطراف پانی ہے اور چوتھی طرف خشکی، اسی لیے اسے جزیرہ نما کہا جاتا ہے۔ اس کی حدود عام طور پر یوں بیان کی جاتی ہیں کہ مشرق میں خلیجِ فارس اور خلیجِ عمان، جنوب میں بحرِ عرب، مغرب میں بحیرہ احمر اور شمال میں شام و عراق کے صحرائی اور زرعی علاقے واقع ہیں۔ شمالی حد کے بارے میں جغرافیہ دانوں میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے دریائے فرات تک کے علاقے کو عرب میں شامل کیا ہے اور بعض نے صحرائے شام کو حد قرار دیا ہے، مگر اس پر اتفاق ہے کہ حجاز، نجد، یمن، عمان، بحرین یعنی الاحساء کا ساحلی علاقہ، حضرموت اور یمامہ اس کے بڑے اور معروف حصے تھے۔ رقبے کے اعتبار سے یہ ایک وسیع خطہ تھا جس کا بیشتر حصہ صحرا، ریگستان اور بنجر پہاڑوں پر مشتمل تھا، جبکہ زرخیز علاقے زیادہ تر جنوب یعنی یمن اور کچھ ساحلی و نخلستانی حصوں تک محدود تھے۔

جزیرہ عرب کی اندرونی تقسیم بھی اس کی سیاست کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ مغربی ساحلی پٹی کو حجاز کہا جاتا تھا جہاں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ یعنی قدیم یثرب اور طائف جیسے شہر آباد تھے۔ درمیانی بلند سطح مرتفع علاقہ نجد کہلاتا تھا جو زیادہ تر بدوی قبائل کا مسکن تھا۔ جنوب مغربی زرخیز اور بارانی خطہ یمن تھا جسے اس کی سرسبزی کی وجہ سے عربِ سعید بھی کہا گیا ہے۔ جنوب مشرق میں عمان اور مشرقی ساحل پر بحرین کے علاقے تھے، جبکہ نجد اور حجاز کے درمیان یمامہ کا نخلستانی علاقہ بھی اپنی الگ حیثیت رکھتا تھا۔ اس تقسیم کا سیاسی نتیجہ یہ تھا کہ ہر خطے کی معیشت، مزاج اور حکومتی ساخت دوسرے سے مختلف تھی۔ یمن میں باقاعدہ بادشاہتیں قائم ہوئیں کیونکہ وہاں زراعت، بندرگاہیں اور تجارتی راستے موجود تھے، جبکہ حجاز اور نجد میں قبائلی نظام غالب رہا کیونکہ صحرائی زندگی میں قبیلہ ہی تحفظ، انصاف اور معیشت کی اصل اکائی تھا۔ یہی پس منظر آگے چل کر اسلام کے سیاسی نظام کی انفرادیت کو واضح کرتا ہے۔

اسلام سے قبل اہم حکومتیں: یمن کی بادشاہتیں

جزیرہ عرب کے جنوب میں یمن وہ خطہ تھا جہاں اسلام سے صدیوں پہلے منظم حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہاں معین، سبا اور حمیر کی بادشاہتیں یکے بعد دیگرے قائم ہوئیں۔ سبا کی حکومت خاص طور پر مشہور ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ سبا اور سورۃ النمل کے مفاہیم میں بھی ملتا ہے، اور ملکہ سبا کا واقعہ بھی اسی پس منظر سے جڑا ہوا ہے۔ سبا کی خوش حالی کی بنیاد زراعت، سدِ مآرب جیسے آب پاشی کے نظام اور بخور و مصالحہ جات کی تجارت تھی جو یمن سے شام تک جاتی تھی۔ بعد میں حمیری حکومت قائم ہوئی جس کے بعض حکمرانوں نے یہودیت اختیار کی اور بعض ادوار میں حبشہ اور فارس کے اثرات بھی یمن پر غالب آئے۔ چھٹی صدی عیسوی میں یمن پہلے حبشی اقتدار اور پھر ایرانی اثر کے تحت رہا، یہاں تک کہ اسلام کے ظہور کے وقت یمن کا ایک حصہ ساسانی گورنر کے ماتحت تھا۔ ان حکومتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا جنوبی حصہ بادشاہت، ٹیکس، فوج اور انتظامی ڈھانچے سے ناواقف نہیں تھا، البتہ ان حکومتوں کا دائرہ یمن تک محدود رہا اور پورا جزیرہ کبھی ایک حکومت کے تحت متحد نہ ہوا۔

شمال کی سرحدی ریاستیں: غسانی اور لخمی (حیرہ)

جزیرہ عرب کے شمال میں دو اہم عرب ریاستیں قائم تھیں جو بڑی سلطنتوں کی سرحدی محافظ سمجھی جاتی تھیں۔ شام کی سرحد پر غسانی ریاست تھی جس کے حکمران بازنطینی سلطنت کے حلیف تھے اور ان کا دارالحکومت جابیہ کے گردنواح میں رہا۔ غسانی عرب عیسائیت قبول کر چکے تھے اور ان کا کام شام کی سرحد کو بدوی حملوں سے بچانا اور بازنطینیوں کی طرف سے صحرائی قبائل پر نظر رکھنا تھا۔ دوسری طرف عراق کی سرحد پر حیرہ کی لخمی ریاست تھی جس کے حکمران آلِ منذر کہلاتے تھے اور وہ ساسانی سلطنت ایران کے حلیف تھے۔ حیرہ علم و ادب کا بھی مرکز بن گیا تھا اور عربی شاعری کی تاریخ میں اس کا دربار مشہور ہے۔ ان دونوں ریاستوں کا مطالعہ اس لیے اہم ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت عرب براہِ راست دو عالمی طاقتوں یعنی روم اور فارس کے سیاسی دباؤ کے درمیان کھڑا تھا، اور مدینہ کی اسلامی ریاست کو بعد میں انہی دونوں طاقتوں سے واسطہ پڑا۔ سریہ اور غزوات کے مطالعے میں یہ پس منظر بار بار سامنے آتا ہے۔

کندہ، مکہ اور دیگر سیاسی مراکز

درمیانی عرب میں پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں کندہ کی حکومت نے قبائل کو متحد کرنے کی کوشش کی اور کچھ عرصے کے لیے نجد و یمامہ کے قبائل پر اس کا اثر قائم رہا، مگر یہ اتحاد پائیدار ثابت نہ ہوا اور حکمران خاندان کے اندرونی اختلافات نے اسے کمزور کر دیا۔ اس ناکامی سے معلوم ہوتا ہے کہ قبائلی عصبیت عرب کی سیاست کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ حجاز میں صورتِ حال مختلف تھی۔ مکہ مکرمہ میں کوئی بادشاہ نہیں تھا بلکہ قریش کے بڑے خاندانوں کی مشاورت سے شہر کا انتظام چلتا تھا۔ کعبہ کی مجاوری، حاجیوں کو پانی پلانے یعنی سقایہ اور کھانا کھلانے یعنی رفادہ جیسی خدمات مختلف خاندانوں میں تقسیم تھیں اور دارالندوہ میں اہم فیصلے ہوتے تھے۔ یہ ایک قسم کی قبائلی اشرافیہ کی اجتماعی حکمرانی تھی جو تجارت اور مذہبی مرکزیت کی وجہ سے پوری عرب دنیا میں اثر رکھتی تھی۔ طائف میں بنو ثقیف کا اثر تھا اور یثرب یعنی مدینہ میں اوس و خزرج کے قبائل یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ رہتے تھے، جہاں کوئی متحدہ حکومت نہیں تھی اور قبائلی جنگیں، جن میں بعاث کی جنگ خاص طور پر مشہور ہے، شہر کو تباہ کر رہی تھیں۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں مدینہ کے لوگوں نے ایک منصف اور متحد کرنے والی قیادت کی تلاش میں اسلام قبول کیا۔

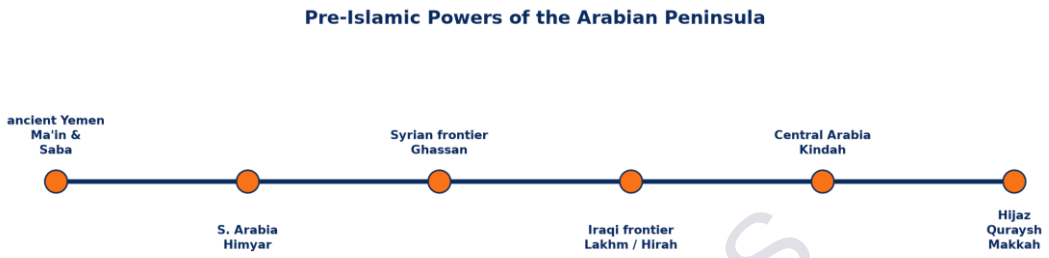
جدول: قبل از اسلام اہم حکومتیں اور ان کی نوعیت

نوعیت اور پہچان	خطہ	حکومت / مرکز
منظم بادشاہت، زراعت و تجارت، سدِ مارب	یمن (جنوب)	سبا و حمیر
بازنطینی حلیف سرحدی ریاست	شام کی سرحد (شمال)	غسانی
ساسانی حلیف ریاست، ادبی مرکز	عراق کی سرحد (شمال)	لخمی / حیرہ
قبائل کو متحد کرنے کی ناکام کوشش	نجد و وسطی عرب	کندہ
بے بادشاہ قبائلی اشرافی مشاورت، دارالندوہ	مکہ (حجاز)	قریش کا نظام
بے مرکزی قبائلی تقسیم، باہمی جنگیں	یثرب / مدینہ	اوس و خزرج

USMAN NOTES www.usmannotes.com

قبل از اسلام سیاسی نظام کی خصوصیات

قبل از اسلام عرب کے سیاسی نظام کی پہلی خصوصیت مرکزیت کا فقدان تھا۔ پورے جزیرے میں کوئی ایک حکومت، ایک قانون یا ایک عدالت موجود نہیں تھی۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ قبیلہ ہی ریاست کا متبادل تھا؛ فرد کی حفاظت، اس کے جرم کی ذمہ داری اور اس کے خون کا بدلہ سب قبیلے سے جڑا ہوا تھا۔ تیسری خصوصیت عصبیت تھی، یعنی اپنے قبیلے کا ساتھ دینا خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر، جس کا نتیجہ طویل قبائلی جنگوں کی صورت میں نکلا۔ چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ حکمرانی کی بنیاد زیادہ تر نسب، دولت اور ذاتی اثر تھی، تحریری آئین یا عوامی احتساب کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ پانچویں خصوصیت یہ تھی کہ عورتوں، غلاموں اور کمزور طبقوں کو سیاسی عمل میں کوئی باقاعدہ حق حاصل نہیں تھا۔ البتہ اس نظام میں کچھ اچھی روایات بھی موجود تھیں، جیسے مہمان نوازی، وعدے کی پابندی، حلف کے ذریعے مظلوم کی مدد اور مشورے کی مجلس۔ اسلام نے اچھی روایات کو برقرار رکھا اور ظلم و عصبیت پر مبنی پہلوؤں کی اصلاح کی۔ اس توازن کو سمجھنا سیرت کے سیاسی مطالعے کی بنیاد ہے۔



شکل: جزیرہ عرب کی قبل از اسلام بڑی سیاسی طاقتیں

موجودہ دور کا سیاسی نظام اور طرزِ حکمرانی

موجودہ دور میں جزیرہ عرب کئی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہے، جن میں سعودی عرب سب سے بڑا ملک ہے، اس کے علاوہ یمن، عمان، متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین اور کویت اسی خطے کی ریاستیں ہیں۔ ان ریاستوں میں تحریری آئین یا بنیادی قوانین، باقاعدہ عدالتیں، وزارتیں، فوج و پولیس کے ادارے اور بین الاقوامی سفارتی تعلقات موجود ہیں۔ بعض ریاستوں میں بادشاہت قائم ہے اور بعض میں منتخب یا مشاورتی ادارے بھی موجود ہیں، مگر مشترکہ بات یہ ہے کہ اب حکمرانی قبیلے کے بجائے ریاست کے اداروں کے ذریعے ہوتی ہے، شہریت کی قانونی حیثیت متعین ہے اور ریاست اقوامِ متحدہ جیسے عالمی اداروں کی رکن ہے۔ اسی طرح جزیرہ عرب سے باہر کے مسلم ممالک سمیت دنیا بھر میں جمہوری، صدارتی اور پارلیمانی نظاموں کی مختلف صورتیں بھی رائج ہیں جن کا مطالعہ آگے کے سوالات میں بھی آئے گا۔ دورِ حاضر کا نظام گذشتہ دور کے مقابلے میں ادارہ جاتی، تحریری اور بین الاقوامی قانون سے جڑا ہوا ہے، اگرچہ عمل درآمد کے مسائل ہر ملک میں اپنی نوعیت کے موجود ہیں۔

تقابلی جائزہ

دونوں ادوار کا تقابل کیا جائے تو سب سے بڑا فرق مرکزیت کا ہے۔ قبل از اسلام عرب میں کوئی مرکزی ریاست نہیں تھی، آج ہر خطہ ایک منظم ریاست کے تحت ہے۔ دوسرا فرق قانون کا ہے؛ پہلے رواج اور قبائلی روایت ہی قانون تھی، آج تحریری قوانین اور عدالتی نظام موجود ہے۔ تیسرا فرق قیادت کے انتخاب اور جواب دہی کا ہے؛ پہلے قیادت نسب و طاقت سے ملتی تھی اور اس کا کوئی باقاعدہ احتساب نہیں ہوتا تھا، آج کے نظاموں میں اصولی طور پر قیادت آئینی طریقے سے بنتی ہے اور عدلیہ، میڈیا اور عوامی رائے کے

سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ چوتھا فرق شہری حقوق کا ہے؛ پہلے حقوق قبیلے کی رکنیت سے ملتے تھے، آج شہریت کی بنیاد پر مساوی قانونی حقوق کا تصور عام ہے۔ پانچواں فرق خارجی تعلقات کا ہے؛ پہلے قبائل کے معاہدے اور حلف ہی خارجہ پالیسی تھے، آج سفارت کاری، معاہدے اور عالمی قانون اس کی بنیاد ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ مسائل دونوں ادوار میں مشترک محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً عصبیت کی جدید صورتیں، طاقت کی کشمکش اور انصاف کی فراہمی کا چیلنج۔ اسلام نے چودہ سو سال قبل مدینہ میں جو اصول دیے، یعنی تحریری میثاق، قانون کی بالادستی، اقلیتوں کے حقوق اور مشاورت، وہ آج کے اچھے نظاموں کی بنیادی اقدار سے حیران کن حد تک ہم آہنگ ہیں، اور یہی نکتہ اس کورس کے مطالعے کو موجودہ دور سے جوڑتا ہے۔

نتیجہ

اختتام پر کہا جا سکتا ہے کہ جزیرہ عرب تین اطراف سمندر سے گھرا ہوا ایک وسیع جزیرہ نما تھا جس کے جنوب میں یمن کی منظم بادشاہتیں، شمال میں غسانی و لخمی سرحدی ریاستیں، وسط میں کندہ کی ناکام وحدت کوشش اور حجاز میں قریش کا قبائلی اشرافی نظام قائم تھا، مگر پورا خطہ کبھی ایک ریاست میں متحد نہیں ہوا تھا۔ اس سیاسی بکھراؤ، عصبیت اور انصاف کے فقدان کے ماحول میں مدینہ میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست ایک بالکل نئی مثال تھی جس نے تحریری معاہدے، قانون اور اصولوں کی بنیاد پر مختلف قبائل اور مذاہب کے لوگوں کو ایک سیاسی وحدت میں جوڑ دیا۔ قبل از اسلام اور موجودہ نظاموں کا تقابل ہمیں سکھاتا ہے کہ اچھی حکمرانی کی بنیاد ہر دور میں عدل، قانون کی حکمرانی اور کمزور کا تحفظ ہے، اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ان اقدار کی سب سے عملی اور تاریخی مثال پیش کرتی ہے۔ طالب علم کے لیے اس سوال کا حاصل یہ ہے کہ وہ سیرت کے سیاسی واقعات کو ان کے جغرافیائی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ جوڑ کر پڑھے، تب ہی ان کی اصل اہمیت واضح ہوتی ہے۔

سوال نمبر 2: ریاستِ مدینہ کے استحکام میں میثاقِ مدینہ کا کردار (20 نمبر)

سوال نمبر 2: مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے استحکام میں میثاقِ مدینہ کے کردار پر مفصل نوٹ قلمبند کریں۔ (20)

تعارف

ہجرتِ مدینہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ ایک ایسے شہر میں منظم ریاست قائم کی جائے جو قبائلی جنگوں سے تباہ حال تھا، جہاں مہاجرین بے گھر ہو کر آئے تھے، انصار کے دو بڑے قبائل اوس و خزرج ایک دوسرے کے پرانے حریف تھے اور یہودی قبائل اپنی الگ سیاسی و معاشی حیثیت رکھتے تھے۔ اس چیلنج کا جواب میثاقِ مدینہ کی صورت میں سامنے آیا، جو سیرت نگاروں، خصوصاً ابنِ ہشام کی روایت کے مطابق ہجرت کے ابتدائی دور میں تحریر کیا گیا۔ اس دستاویز کو دنیا کی ابتدائی تحریری آئینی دستاویزات میں شمار کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میثاق نے نوزائیدہ اسلامی ریاست کے استحکام میں کیا کردار ادا کیا۔ اس جواب میں میثاق کا پس منظر، اس کی بنیادی نوعیت کی شقیں اور پھر داخلی امن، خارجی دفاع، مذہبی آزادی اور سماجی ہم آہنگی کے اعتبار سے اس کے اثرات کا مفصل جائزہ پیش کیا جائے گا۔ یہاں آیات و روایات کا صرف مفہوم اور حوالہ دیا گیا ہے، لفظی اقتباس نقل کرنا گائیڈ کا اسلوب نہیں۔

پس منظر: ہجرت کے وقت مدینہ کی صورتِ حال

یثرب یعنی مدینہ اس وقت انتشار کا شکار تھا۔ بعاث کی جنگ نے اوس و خزرج کو تھکا دیا تھا مگر دشمنی ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ قلعوں، زراعت اور تجارت پر قابض تھے اور عرب قبائل کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکہ سے آنے والے مہاجرین کے پاس نہ گھر تھا نہ روزگار، اور قریشِ مکہ کی دشمنی بھی واضح تھی جو کسی وقت بھی مدینہ پر دباؤ ڈال سکتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر صرف مذہبی دعوت پر اکتفا کیا جاتا اور شہر کے سیاسی خلا کو پر نہ کیا جاتا تو ریاست چند مہینوں میں اندرونی انتشار اور بیرونی حملے کا شکار ہو سکتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی بصیرت اور عملی حکمت کے ساتھ تین بڑے اقدامات فرمائے جن میں مسجدِ نبوی کی تعمیر، مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات اور پھر پورے شہر کے لیے میثاقِ مدینہ شامل ہیں۔ ان تینوں میں میثاق سب سے زیادہ سیاسی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے ریاست کی قانونی بنیاد فراہم کی۔

میثاقِ مدینہ کی بنیادی نوعیت اور شقیں

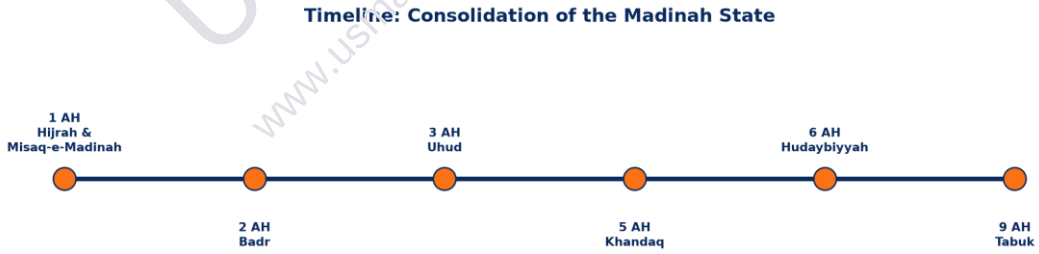
میثاقِ مدینہ کی روایت میں جو بنیادی باتیں منقول ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ تمام دستخط کنندہ گروہ مل کر ایک سیاسی برادری یعنی امت کی حیثیت رکھیں گے، خواہ ان کے مذاہب الگ ہوں۔ مسلمانوں کے درمیان خون بہا اور فدیے کے معاملات پرانی معروف روایت کے مطابق عدل سے طے ہوں گے۔ کوئی گروہ دوسرے کو اطلاع دیے بغیر الگ سے دشمن سے صلح نہیں کرے گا۔ شہر پر حملے کی صورت میں سب مل کر دفاع کریں گے اور مدینہ یعنی یثرب کا اندرونی علاقہ سب کے لیے حرم کی حیثیت رکھے گا جہاں خون ریزی ممنوع ہو گی۔ یہودی قبائل کو ان کے دین پر رہنے کی آزادی ہو گی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے شہر کے دفاع اور اخراجات میں اپنے حصے کے شریک ہوں گے جب تک وہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ کریں۔ کسی مجرم کو محض اس کے قبیلے یا تعلق کی وجہ سے پناہ نہیں دی جائے گی۔ تنازعات کے فیصلے کے لیے مرجع اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع قرار پایا۔ ان شقوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ سیاسی وفاداری کی بنیاد قبیلہ نہیں بلکہ معاہدۂ شہری ذمہ داری قرار پائی۔ یہ تصور اس دور کے عرب میں بالکل نیا تھا۔

داخلی استحکام میں کردار

میثاق کا سب سے پہلا ثمر داخلی امن کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اوس و خزرج کی پرانی دشمنی اس لیے ختم ہو سکی کہ دونوں اب ایک بڑی سیاسی وحدت کے رکن بن گئے تھے اور ان کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے والا ایک متفقہ مرجع موجود تھا۔ خون بہا اور انتقام کے قبائلی سلسلے کی جگہ قانون نے لے لی، کیونکہ طے پا گیا کہ جرم کی سزا فرد کو ملے گی، پورا قبیلہ انتقام کا نشانہ نہیں بنے گا۔ اس سے شہر میں وہ سکون پیدا ہوا جس میں تجارت، زراعت اور تعلیم و تربیت کا کام آگے بڑھ سکا۔ مہاجرین کو بھی اس نظام سے تحفظ ملا کیونکہ وہ اب کسی قبیلے کے مہمان نہیں بلکہ ریاست کے باقاعدہ شہری تھے۔ طالب علم کو یہ نکتہ خاص طور پر سمجھنا چاہیے کہ ریاست کا استحکام صرف فوج سے نہیں آتا بلکہ اس احساس سے آتا ہے کہ ہر شہری کا حق محفوظ ہے اور تنازعہ طاقت سے نہیں قانون سے حل ہو گا۔ میثاق نے مدینہ کے ہر باشندے کو یہی احساس دیا، اسی لیے چند برسوں میں یہ چھوٹا سا شہر ایک مضبوط ریاست کا مرکز بن گیا۔

خارجی دفاع اور سیاسی وحدت میں کردار

میثاق نے مدینہ کو خارجی خطرات کے مقابلے میں بھی ایک اکائی بنا دیا۔ شق یہ تھی کہ حملے کی صورت میں تمام گروہ مشترکہ دفاع کریں گے اور کوئی فریق تنہا دشمن سے معاہدہ نہیں کرے گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قریشِ مکہ کو یہ پیغام ملا کہ مدینہ اب منقسم قبائل کا شہر نہیں رہا بلکہ ایک متحد سیاسی طاقت ہے جس پر حملہ پورے شہر سے جنگ کے مترادف ہو گا۔ بدر، احد اور خندق کے مواقع پر یہی وحدت کام آئی کہ شہر کے بیشتر گروہ دفاع میں شریک رہے یا کم از کم دشمن کا ساتھ دینے سے باز رہے۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ جب بعض گروہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور جنگ کے موقع پر دشمن سے ساز باز کی تو ریاست نے ان کے ساتھ معاہدے کی روح کے مطابق سختی کی، کیونکہ کسی بھی ریاست میں غداری اور معاہدہ شکنی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ایک اصولی نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ میثاق میں حقوق کے ساتھ ذمہ داریاں بھی تھیں اور استحکام اسی وقت قائم رہا جب تک فریقین حقوق و فرائض دونوں کی پابندی کرتے رہے۔ جدید ریاستوں کے آئین بھی اسی اصول پر قائم ہیں۔



شکل: ریاستِ مدینہ کے استحکام کے اہم مراحل

مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق میں کردار

میثاقِ مدینہ کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے غیر مسلم شہریوں کو ان کے دین پر قائم رہنے کی آزادی اور ان کے مال و جان کے تحفظ کی ضمانت دی۔ یہودی قبائل کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنے مذہبی معاملات اپنے طریقے سے انجام دیں اور ان کے ساتھ عدل کیا جائے گا۔ اس ضمانت نے اقلیتوں کو ریاست سے جوڑ دیا اور انہیں یہ احساس دلایا کہ نئی حکومت ان کے لیے خطرہ نہیں بلکہ پرانے انتشار سے بہتر نظام ہے۔ مذہبی آزادی کی یہ تحریری ضمانت اس دور میں دنیا کے بیشتر نظاموں میں موجود نہیں تھی جہاں مذہبی اختلاف پر ظلم

عام تھا۔ بعد میں اسلامی تاریخ میں اہلِ کتاب شہریوں کے حقوق کے جو اصول بنے، ان کی عملی بنیاد بھی اسی میثاق سے ملتی ہے۔ طالب علم کے لیے یہاں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ اس بحث کو خالص تاریخی و تعلیمی دائرے میں رکھا جائے؛ کسی معاصر تنازعے میں شرعی یا قانونی رائے دینا اہلِ علم اور مجاز اداروں کا کام ہے، گائیڈ کا مقصد صرف سیرت کے اصولوں کی تفہیم ہے۔

معاشی و سماجی استحکام اور مجموعی جائزہ

میثاق کے اثرات معاشی زندگی پر بھی پڑے۔ امن قائم ہونے سے تجارتی راستے محفوظ ہوئے، بازار کا نظام منظم ہوا جس کی تفصیل اگلے سوال میں آئے گی اور زرعی پیداوار میں بہتری آئی۔ سماجی سطح پر میثاق نے فرد کی شناخت قبیلے سے بڑھا کر شہریت سے جوڑ دی، جو اس دور کے لحاظ سے انقلابی تبدیلی تھی۔ البتہ منصفانہ جائزہ یہ بھی کہتا ہے کہ میثاق اپنے تمام اہداف میں اسی وقت کامیاب رہا جب فریقین نے اس کی پاسداری کی؛ جہاں معاہدہ شکنی ہوئی وہاں اعتماد متاثر ہوا اور ریاست کو سخت فیصلے کرنے پڑے۔ اس لیے میثاق کو صرف ایک دستاویز نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا نظام سمجھنا چاہیے جس کی جان باہمی اعتماد اور قانون کی پابندی تھی۔ آج کے طلبہ کے لیے اس کا سبق یہ ہے کہ کسی بھی ریاست یا ادارے کا استحکام تحریری اصولوں، ان کے منصفانہ نفاذ اور شہریوں کی ذمہ داری کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں یہی امتزاج قائم فرمایا، اور یہی وجہ ہے کہ میثاقِ مدینہ کو اسلامی سیاسی فکر کی بنیادی دستاویز سمجھا جاتا ہے۔

جدول: میثاقِ مدینہ کے اثرات کا خلاصہ

میدان	میثاق کی شق کا مفہوم	استحکام پر اثر
داخلی امن	تنازعات کا فیصلہ ایک مرجع سے	قبائلی انتقام کا خاتمہ، قانون کی حکمرانی
دفاع	مشترکہ دفاع، الگ صلح کی ممانعت	بیرونی دشمن کے سامنے متحد شہر
اقلیتی حقوق	مذہبی آزادی اور جان و مال کا تحفظ	اقلیتوں کا ریاست سے اعتماد و تعلق

تجارت وزراعت کی بحالی وترقی	امن وامان کی ضمانت	معیشت
قبیلے سے ریاست کی طرف تاریخی پیش رفت	وفاداری کی بنیاد معاہدہ، نہ کہ صرف نسب	شہریت

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ میثاقِ مدینہ نے مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کو وہ قانونی، سیاسی اور اخلاقی بنیاد فراہم کی جس کے بغیر اس کا استحکام ممکن نہیں تھا۔ اس نے منقسم قبائل کو ایک سیاسی امت میں جوڑا، داخلی تنازعات کے لیے قانون اور مرجع مقرر کیا، خارجی دفاع کو مشترکہ ذمہ داری بنایا اور اقلیتوں کو تحریری حقوق دیے۔ ان چاروں کاموں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ ایک چھوٹا اور انتشار زدہ شہر چند سال میں منظم ریاست کا مرکز بن گیا جس نے آگے چل کر پورے جزیرہ عرب کو متحد کیا۔ میثاقِ مدینہ آج بھی یہ سبق دیتا ہے کہ ریاست کی مضبوطی کا راز طاقت سے زیادہ عدل، معاہدے کی پاسداری اور تمام شہریوں کو نظام میں شریک کرنے میں ہے۔ یہی وہ سیاسی بصیرت ہے جو سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر دور کے لیے نمونہ بناتی ہے۔

سوال نمبر 3: عہدِ نبوی میں بازارِ مدینہ کا نظام اور پاکستان کے بازاروں کی اصلاح (20 نمبر)

سوال نمبر 3: عہدِ نبوی میں مدینہ طیبہ میں قائم بازار کے نظام پر نوٹ لکھیں نیز اس کی روشنی میں پاکستان کے بازاروں کی اصلاح کے لئے تجاویز قلمبند کریں۔ (20)

تعارف

معیشت کسی بھی ریاست کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے اور بازار اس معیشت کا سب سے نمایاں مرکز ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عبادت اور سیاست کی اصلاح نہیں فرمائی بلکہ بازار جیسے عملی ادارے کو بھی نئے اصولوں پر منظم کیا۔ ہجرت سے پہلے مدینہ کی تجارت پر زیادہ تر یہودی قبائل کا اثر تھا اور بنو قینقاع کا بازار کاروبار کا مرکز تھا جہاں سودی لین دین اور اجارہ داری کی فضا پائی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں مسلمان تاجر نہ مذہبی اصولوں کے مطابق کاروبار کر سکتے تھے اور

نہ معاشی طور پر آزاد تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے الگ بازار قائم فرما کر ایک ایسی منڈی کی بنیاد رکھی جہاں تجارت عبادت کے جذبے، امانت اور عدل کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس جواب میں پہلے بازارِ مدینہ کے قیام اور اس کے اصول بیان کیے جائیں گے، پھر نگرانی کے نظام کا ذکر ہو گا اور آخر میں انہی اصولوں کی روشنی میں پاکستان کے موجودہ بازاروں کی اصلاح کے لیے عملی تجاویز پیش کی جائیں گی۔

بازارِ مدینہ کا قیام

سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لیے ایک مناسب جگہ منتخب فرما کر وہاں بازار قائم کیا اور اسے مسلمانوں کا بازار قرار دیا۔ اس اقدام کے کئی مقاصد تھے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ مسلمان تاجر سودی اور ناجائز رسوم سے آزاد ماحول میں کاروبار کر سکیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ مہاجرین، جن کا اصل سرمایہ مکہ میں رہ گیا تھا، دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، کیونکہ مہاجرین میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے اہم تاجر بھی شامل تھے جنہوں نے اسی بازار سے حلال تجارت کا آغاز کیا۔ تیسرا مقصد قیمتوں اور لین دین پر ریاست کی اخلاقی نگرانی قائم کرنا تھا۔ چوتھا مقصد بازار کو صرف خرید و فروخت کی جگہ نہیں بلکہ سماجی اعتماد کا مرکز بنانا تھا۔ روایات کے مفہوم کے مطابق اس بازار میں بیٹھنے والوں سے کرایہ یا محصول کی وہ صورتیں نہیں لی جاتیں تھیں جو اجارہ داری پیدا کرتی ہیں، تاکہ چھوٹا تاجر بھی آسانی سے کاروبار شروع کر سکے۔ یہ اصول آج کے دور میں بھی اہم ہے کہ بازار میں داخلے کی لاگت کم ہو تو روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں۔

بازار کے بنیادی اصول

بازارِ مدینہ کا سب سے بڑا اصول سود کی ممانعت تھی۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرہ میں سود کی حرمت کا واضح حکم موجود ہے جس کے مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اس حکم نے تجارت کو استحصال سے پاک کر دیا، کیونکہ سود میں ایک فریق کا نفع یقینی اور دوسرے کا خطرہ مستقل ہوتا ہے۔ دوسرا اصول ذخیرہ اندوزی یعنی احتکار کی ممانعت تھا؛ حدیث کے مفہوم کے مطابق گرانی کی نیت سے اشیائے ضرورت روک لینے والا شخص گناہ گار قرار دیا گیا ہے۔ تیسرا اصول ناپ تول کی درستگی تھا، جس پر قرآن مجید میں سورۃ المطففین میں سخت تنبیہ آئی ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔ چوتھا اصول دھوکا دہی کی ممانعت تھا؛ ایک مشہور واقعے کے

مفہوم کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلے کے ڈھیر میں ہاتھ ڈالا تو نیچے سے گیلا غلہ نکلا اور آپ نے فرمایا کہ دھوکا دینے والا ہم میں سے نہیں، یعنی اس کا عمل امت کے اخلاقی معیار کے خلاف ہے۔ پانچواں اصول یہ تھا کہ ایک شخص کے سودے پر دوسرا سودا نہ کرے اور خریدار کو بڑھا چڑھا کر قیمت بڑھانے کے لیے جعلی بولی یعنی نجش نہ لگائی جائے۔ چھٹا اصول یہ تھا کہ شہر سے باہر جا کر آنے والے قافلے کا مال راستے میں سستا خرید کر منڈی میں مہنگا بیچنے کی صورت، یعنی تلقی الرکبان، پسند نہیں کی گئی کیونکہ اس میں کسان اور قافلے والے کو اصل قیمت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام اصولوں کا خلاصہ ایک جملے میں یہ ہے کہ نفع حلال ہے مگر دھوکا، ظلم اور استحصال حرام ہے۔

قیمتوں کا مسئلہ اور نگرانی کا نظام

بازارِ مدینہ میں قیمتوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔ ایک موقع پر جب قیمتوں میں اضافہ ہوا تو بعض لوگوں نے نرخ مقرر کرنے کی درخواست کی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیمتوں کو زبردستی مقرر کرنے سے انکار فرمایا اور مفہوم یہ بیان فرمایا کہ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اللہ کے اختیار میں ہے اور آپ کسی پر ظلم کر کے اللہ سے ملنا پسند نہیں فرماتے۔ اس واقعے سے اصول یہ ملتا ہے کہ ریاست کو طلب و رسد کے قدرتی نظام میں بے جا مداخلت نہیں کرنی چاہیے، البتہ اسی سیرت سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہاں ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ یا دھوکا ہو وہاں نگرانی اور سزا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہی توازن آگے چل کر محتسب کے ادارے کی بنیاد بنا جو بازار میں ناپ تول، ملاوٹ اور قیمتوں کی خلاف ورزیوں کی نگرانی کرتا تھا۔ خلفائے راشدین کے دور میں یہ نظام مزید منظم ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشی نظام نہ مکمل بے لگام آزادی دیتا ہے اور نہ مکمل جبری کنٹرول، بلکہ اخلاقی حدود کے اندر آزاد تجارت کا حامی ہے۔ طالب علم کے لیے یہ نکتہ اہمیت رکھتا ہے کہ سیرت کی معاشی تعلیمات کو کسی ایک واقعے سے نہیں بلکہ مجموعی اصولوں سے سمجھا جائے۔

جدول: بازارِ مدینہ کے اصول اور ان کا مقصد

اصول	صورت	مقصد
سود کی ممانعت	سودی لین دین ختم	استحصال کا خاتمہ، حقیقی تجارت کی حوصلہ افزائی

قیمتوں کو مصنوعی گرانی سے بچانا	اشیائے ضرورت روکنے پر پابندی	احتکار کی ممانعت
خریدار کے حق کی حفاظت	معیاری پیمانوں کی نگرانی	ناپ تول کی درستگی
بازار میں اعتماد کی فضا	عیب چھپانے پر تنبیہ و سزا	دھوکے کی ممانعت
منصفانہ مقابلہ اور شفاف قیمت	نجش اور سودے پر سودا ممنوع	جعلی بولی کی ممانعت

پاکستان کے بازاروں کی موجودہ صورتِ حال

پاکستان کے بازاروں کا جائزہ لیا جائے تو کئی خوبیاں بھی ہیں اور کئی کمزوریاں بھی۔ خوبیوں میں محنتی تاجر برادری، منڈیوں کا جال اور چھوٹے کاروباروں سے لاکھوں خاندانوں کا روزگار شامل ہے۔ کمزوریوں میں ملاوٹ، کم ناپ تول، ذخیرہ اندوزی کے رجحانات، اشیائے خور و نوش میں غیر معیاری مواد، قیمتوں کی فہرستوں پر عمل نہ ہونا، دکانوں کے آگے تجاوزات اور نامناسب صفائی عام شکایات ہیں۔ اس کے علاوہ سودی قرضوں پر چلنے والے چھوٹے کاروبار مالی دباؤ کا شکار رہتے ہیں اور صارفین کی شکایات کا ازالہ کرنے والا نظام بھی کمزور ہے۔ ان مسائل کی بڑی وجہ یہ نہیں کہ قوانین موجود نہیں؛ پاکستان میں بھی صارف تحفظ کے قوانین، فوڈ اتھارٹیز اور پرائس کنٹرول کے نظام موجود ہیں، مسئلہ عمل درآمد، اخلاقی تربیت اور اجتماعی ذمہ داری کے فقدان کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح کے لیے صرف قانون نہیں بلکہ سیرت کی اخلاقی تربیت کو بھی ساتھ جوڑنا ہو گا، کیونکہ بازارِ مدینہ کی اصل طاقت قانون سے پہلے تاجر کے ضمیر کی بیداری تھی۔

اصلاح کے لیے تجاویز

پاکستان کے بازاروں کی اصلاح کے لیے سیرت کی روشنی میں درج ذیل تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں۔ اول، تاجر تنظیموں کے تعاون سے اخلاقی تربیت کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا جائے جس میں حلال و حرام، امانت اور صارف کے حقوق پر علماء اور ماہرینِ معیشت مشترکہ رہنمائی دیں۔ دوم، ناپ تول کے پیمانوں کی تصدیق اور اچانک معائنہ مؤثر بنایا جائے اور کم تولنے پر جرمانے کے ساتھ اصلاحی عمل بھی ہو۔ سوم، ذخیرہ اندوزی کے خلاف قانون پر بغیر کسی امتیاز کے عمل کیا جائے، خاص طور پر رمضان اور بحران کے دنوں میں

اشیائے ضرورت کی نگرانی سخت ہو۔ چہارم، قیمتوں کی فہرستیں ڈیجیٹل ذرائع سے عوام تک پہنچائی جائیں اور شکایت کے لیے آسان موبائل نظام ہو جس پر فوری کارروائی کی رپورٹ بھی ملے۔ پنجم، چھوٹے تاجروں کو بلاسود یا کم لاگت قرضوں کی سہولت دی جائے تاکہ وہ سودی دباؤ سے نکل سکیں۔ ششم، ملاوٹ اور غیر معیاری خوراک پر سخت سزائیں ہوں کیونکہ یہ صرف معاشی جرم نہیں بلکہ انسانی جان کے تحفظ سے جڑا مسئلہ ہے۔ ہفتم، بازاروں میں تجاوزات کا خاتمہ تاجروں سے مشاورت کے ساتھ کیا جائے اور متبادل جگہ کا بندوبست ہو تاکہ اصلاح ظلم نہ بن جائے۔ ہشتم، صارفین کو بھی اپنے حقوق سے آگاہ کیا جائے کیونکہ باشعور صارف خود بازار کی سب سے بڑی نگران قوت ہوتا ہے۔ نہم، تاجر برادری کے ایمان دار نمائندوں کو اعزاز دیا جائے تاکہ نیکی کی سماجی قدر بڑھے۔ دہم، مساجد اور تعلیمی ادارے معاشی اخلاقیات کو اپنے خطبات و نصاب کا حصہ بنائیں۔ ان تجاویز کا مقصد بازار کو ریاست کے جبر سے نہیں بلکہ اعتماد، شفافیت اور اخلاق سے آباد کرنا ہے، جو عہدِ نبوی کے بازار کی اصل روح تھی۔

نتیجہ

اختتام پر کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ نبوی کا بازارِ مدینہ دنیا کی تاریخ میں اس بات کی پہلی عملی مثالوں میں سے ہے کہ تجارت اور اخلاق ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس بازار میں سود، ذخیرہ اندوزی، کم ناپ تول اور دھوکا ممنوع تھا، قیمتوں کا قدرتی نظام محترم تھا مگر ظلم پر نگرانی بھی موجود تھی اور چھوٹے تاجر کے لیے داخلہ آسان رکھا گیا تھا۔ پاکستان کے بازاروں کی اصلاح بھی اسی توازن سے ممکن ہے کہ قانون کا مؤثر نفاذ ہو، تاجر کی اخلاقی تربیت ہو، صارف باشعور ہو اور ریاست مظلوم کی دادرسی کرے مگر قدرتی کاروباری عمل میں بے جا مداخلت نہ کرے۔ جب بازار اعتماد کی جگہ بن جائے تو وہ صرف معیشت نہیں بلکہ پوری تہذیب کی ترقی کا ذریعہ بن جاتا ہے، اور یہی سیرتِ طیبہ کا وہ معاشی درس ہے جو آج بھی پوری طرح قابلِ عمل ہے۔

سوال نمبر4: سیرتِ طیبہ کی روشنی میں جدید اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی (20 نمبر)

سوال نمبر4: موجودہ زمانے میں ایک اسلامی ریاست اپنی خارجہ پالیسی بنانے کے لئے سیرتِ طیبہ سے کس طرح راہنمائی حاصل کر سکتی ہے؟ تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔ (20)

تعارف

خارجہ پالیسی کسی ریاست کے دوسری ریاستوں اور عالمی اداروں سے تعلقات کے اصولوں کا نام ہے۔ جدید دنیا میں یہ میدان سفارت کاری، معاہدوں، تجارت، دفاع اور بین الاقوامی قانون پر مشتمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک جدید اسلامی ریاست اس میدان میں سیرتِ طیبہ سے کیا راہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینہ کی چھوٹی سی ریاست کے بڑی سلطنتوں یعنی روم، فارس، حبشہ اور مصر کے ساتھ تعلقات کی مکمل مثالیں موجود ہیں، جن میں خطوط بھیجنے، سفیر روانہ کرنے، معاہدے کرنے، صلح کو جنگ پر ترجیح دینے اور معاہدے کی پاسداری جیسے اصول عملی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس جواب میں پہلے سیرت سے ملنے والے بنیادی اصول بیان کیے جائیں گے، پھر ان اصولوں کا جدید خارجہ پالیسی کے اہم شعبوں یعنی سفارت کاری، معاہدات، تجارت، دفاع اور نرم قوت پر اطلاق دکھایا جائے گا۔ یہ ساری بحث علمی و اصولی ہے؛ کسی ریاست کے کسی مخصوص معاصر فیصلے پر شرعی یا قانونی حکم لگانا اس گائیڈ کے دائرے سے باہر ہے، ایسے امور اہلِ علم اور مجاز ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہیں۔

پہلا اصول: امن کو ترجیح اور وفائے عہد

سیرتِ طیبہ سے خارجہ پالیسی کا پہلا اصول یہ ملتا ہے کہ اصل مقصد امن ہے اور جنگ آخری چارہ ہے۔ صلح حدیبیہ اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ سن چھ ہجری میں بظاہر سخت شرائط پر صلح ہوئی، بعض شرائط صحابہ کو وقتی طور پر ناگوار بھی لگیں، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دور رس نتائج دیکھ کر صلح کو قبول فرمایا اور اس کے بعد کے برسوں میں دعوت و امن کا وہ ماحول پیدا ہوا جس میں اسلام تیزی سے پھیلا۔ قرآن مجید میں اس صلح کو فتحِ مبین کے مفہوم سے یاد کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی کامیابی اول و آخر مقاصد کے حصول میں ہے، وقتی جذبات میں نہیں۔ دوسرا اصول وفائے عہد ہے۔ حدیبیہ کے معاہدے کی پابندی اس حد تک کی گئی کہ معاہدے کی شق کے مطابق مکہ سے آنے والے مسلمان کو واپس بھی بھیجا گیا، اگرچہ یہ فیصلہ اخلاقی طور پر مشکل تھا۔ اس سے دنیا کو پیغام گیا کہ مدینہ کی ریاست معاہدے کی پاسداری کو اپنی عزت سمجھتی ہے۔ جدید

خارجہ پالیسی میں یہی اصول ریاست کی ساکھ یعنی کریڈیبلٹی کہلاتا ہے؛ جو ریاست معاہدوں کی پابند ہو اس کی سفارت کاری کو دنیا سنجیدگی سے لیتی ہے۔ اس کے برعکس معاہدہ شکنی ریاست کو تنہا کر دیتی ہے، جیسا کہ سیرت میں ان گروہوں کا انجام دیکھا جا سکتا ہے جنہوں نے عہد توڑا۔

دوسرا اصول: سفارت کاری، خطوط اور مذاکرات

سیرت سے سفارت کاری کے عملی آداب بھی ملتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی طاقتوں کے حکمرانوں کو خطوط بھیجے جن میں قیصر روم، کسریٰ فارس، نجاشی حبشہ، مقوقس مصر اور بحرین و عمان کے حکمران شامل ہیں۔ ان خطوط کی خصوصیات یہ تھیں کہ وہ مختصر، باوقار اور واضح تھے، مخاطب کے مرتبے کا لحاظ رکھا گیا اور پیغام میں دھمکی کے بجائے دعوت اور سلامتی کی پیشکش تھی۔ سفیروں کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا گیا؛ سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ بعض صحابہ کو ان کی زبان دانی، ذہانت اور علاقائی واقفیت کی وجہ سے منتخب کیا گیا۔ اسی طرح مدینہ آنے والے وفود کی عزت و تکریم کی گئی اور نجران کے عیسائی وفد کو مسجدِ نبوی میں عبادت کی اجازت تک دی گئی، جو مذہبی رواداری کی غیر معمولی مثال ہے۔ جدید ریاست کے لیے اس سے راہنمائی ملتی ہے کہ سفیر کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر ہو، مذاکرات میں وقار اور وضاحت ہو، دوسری اقوام کے مذاہب و ثقافت کا احترام کیا جائے اور سخت مؤقف بھی شائستہ زبان میں پیش کیا جائے۔ مذاکرات میں نرمی اور اصولی مضبوطی کا یہ امتزاج سیرت کی سفارت کاری کی پہچان ہے۔

تیسرا اصول: عدل، عدمِ جارحیت اور طاقت کا ذمہ دارانہ استعمال

سیرت کی خارجہ پالیسی کا تیسرا بڑا اصول یہ ہے کہ طاقت کا استعمال دفاع اور ظلم کے خاتمے کے لیے ہو، زمین بڑھانے یا قوموں کو غلام بنانے کے لیے نہیں۔ مدینہ کی ریاست نے اپنی سرحدوں کے دفاع کے لیے سرایا و غزوات کیے مگر سفارت و معاہدے کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ فتحِ مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان اس اصول کی سب سے روشن مثال ہے کہ طاقت کے باوجود انتقام نہیں لیا گیا۔ جدید بین الاقوامی قانون میں بھی جارحیت کی ممانعت اور تنازعات کے پرامن حل کو بنیادی درجہ حاصل ہے، چنانچہ ایک اسلامی ریاست سیرت کی روشنی میں اقوامِ متحدہ کے منشور کے پرامن اصولوں سے ہم آہنگی محسوس کر سکتی ہے کیونکہ ان کا مقصد بھی جنگوں کی روک تھام ہے۔ اسی طرح سیرت سے یہ اصول

بھی ملتا ہے کہ دفاعی تیاری میں کوتاہی نہ کی جائے؛ قرآن مجید میں سورۃ الانفال میں قوت تیار رکھنے کے حکم کا مفہوم یہی ہے کہ مضبوط دفاع دشمن کو جارحیت سے باز رکھتا ہے۔

یہاں بھی یہ واضح رہے کہ یہ اصولی و تاریخی بحث ہے، کسی مخصوص عسکری یا سفارتی اقدام کی شرعی حیثیت کا تعین اس گائیڈ کا موضوع نہیں۔

جدید شعبوں پر اطلاق

ان اصولوں کا جدید خارجہ پالیسی کے شعبوں پر اطلاق یوں کیا جا سکتا ہے۔ سفارت کاری میں سیرت یہ سکھاتی ہے کہ بات چیت کے دروازے مشکل حالات میں بھی بند نہ کیے جائیں، جیسا کہ حدیبیہ سے پہلے اور بعد میں قریش سے رابطے جاری رہے۔ معاہدات میں اصول یہ ہے کہ ہر معاہدہ تحریری، واضح اور دونوں فریقوں کے لیے قابلِ فہم ہو، جیسا کہ میثاقِ مدینہ اور صلح حدیبیہ تحریری دستاویزات تھیں۔ تجارت میں راہنمائی یہ ہے کہ معاشی تعلقات کو سیاسی تعلقات کی بہتری کا ذریعہ بنایا جائے، کیونکہ سیرت میں تجارتی قافلوں اور بازاروں نے بھی ریاستوں و قبائل کو جوڑنے کا کام کیا۔ ہمسایہ پالیسی میں اصول یہ ملتا ہے کہ قریبی قبائل و ریاستوں سے امن معاہدے کیے جائیں، جیسا کہ مدینہ کے گرد و نواح کے قبائل سے کیے گئے، تاکہ ریاست کا دائرہ امن وسیع ہو۔ انسانی ہمدردی کے میدان میں نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کو پناہ ملنے کا واقعہ یہ درس دیتا ہے کہ مظلوموں کی پناہ اور انسانی حقوق کے عالمی اصولوں کی حمایت خارجہ پالیسی کا اخلاقی سرمایہ ہوتی ہے۔ نرم قوت یعنی سافٹ پاور کے اعتبار سے بھی سیرت رہنما ہے کہ ریاست کا اصل اثر اس کے عدل، علم اور کردار سے پیدا ہوتا ہے، صرف اسلحے سے نہیں۔

جدول: سیرت کے اصول اور جدید خارجہ پالیسی میں ان کا اطلاق

جدید اطلاق	تاریخی مثال	سیرت کا اصول
مذاکرات اور پرامن حل کو پہلی ترجیح	صلح حدیبیہ	امن کو ترجیح
بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی سے ساکھ	حدیبیہ کی شرائط کی مکمل پاسداری	وفائے عہد
اہلیت پر مبنی سفارتی انتخاب و شائستہ مکالمہ	حکمرانوں کو خطوط و سفراء	باوقار سفارت کاری

جارحیت سے اجتناب، مؤثر دفاعی تیاری	دفاعی غزوات، فتح مکہ میں عام معافی	عدم جارحیت و دفاع
مذہبی و ثقافتی احترام، اقلیتوں سے حسنِ سلوک	وفدِ نجران کی تکریم	رواداری

مجموعی جائزہ اور احتیاطی نکات

ان اصولوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ سیرت کی خارجہ پالیسی دراصل اصول پسندی اور عملی حکمت کا حسین امتزاج تھی۔ اصولوں میں کوئی سمجھوتا نہیں تھا، مگر طریقہ کار میں حالات کی رعایت، تدریج اور دور اندیشی پوری طرح موجود تھی۔ کبھی صلح کی شرائط قبول کی گئیں، کبھی سختی دکھائی گئی مگر عدل سے انحراف نہیں کیا گیا۔ جدید اسلامی ریاست کے لیے سب سے بڑی راہنمائی یہی ہے کہ وہ اپنے قومی مفاد کو عدل و عہد کی حدود کے اندر حاصل کرے۔ کیونکہ سیرت کی نظر میں مفاد اور اخلاق متضاد نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل ہیں۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ سیرت کے اصولوں کا اطلاق بدلتے ہوئے عالمی نظام میں اہلِ علم، سفارت کاری کے ماہرین اور آئینی اداروں کی مشترکہ فہم سے ہونا چاہیے۔ تاریخی واقعات سے اصول اخذ کرنا علم ہے، مگر کسی مخصوص واقعے کا حکم کسی جدید مسئلے پر براہِ راست چسپاں کرنا درست طریقہ نہیں۔ طالب علم کو یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس احتیاط کے ساتھ سیرت کا مطالعہ خارجہ پالیسی کے طالب علم کو وہ اخلاقی سمت دیتا ہے جو خالص دنیوی مصنفین کے یہاں کم ملتی ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کی اسلامی ریاست سیرتِ طیبہ سے خارجہ پالیسی کے لیے جامع راہنمائی حاصل کر سکتی ہے: امن کو ترجیح دے، معاہدوں کی پاسداری کو اپنی ساکھ بنائے، سفارت کاری میں وقار، اہلیت اور رواداری اختیار کرے، طاقت کو دفاع اور عدل کے لیے استعمال کرے اور اپنی نرم قوت اخلاق و علم سے بڑھائے۔ صلح حدیبیہ، حکمرانوں کو خطوط اور فتح مکہ کی عام معافی جیسے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ اصول صرف کتابی دعوے نہیں بلکہ تاریخ میں آزمائے ہوئے کامیاب اصول ہیں۔ جو ریاست ان اصولوں پر چلتی ہے وہ عالمی برادری میں اعتماد حاصل کرتی ہے اور یہی اعتماد طویل مدت میں اس کی سب سے بڑی طاقت بن جاتا ہے۔ سیرت کا سیاسی مطالعہ اسی لیے صرف ماضی کی تاریخ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی رہنمائی بھی ہے۔

سوال نمبر5: جہاد کی اجازت کا مرحلہ اور غزوہ تبوک کے واقعات ونتائج(20نمبر)

سوال نمبر5: مسلمانوں کو جہاد کی اجازت کب ملی؟وضاحت کریں۔نیز غزوہ تبوک کے واقعات ونتائج تحریر کریں۔(20)

تعارف

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی وعسکری پہلو کا ایک اہم باب یہ ہے کہ مسلمانوں کو قتال یعنی دفاعی جنگ کی اجازت کب اور کن حالات میں ملی اور اس اجازت کے بعد پیش آنے والے بڑے واقعات میں غزوہ تبوک کی کیا حیثیت ہے۔یہ موضوع حساس بھی ہے اور اہم بھی، اس لیے اسے جذبات کے بجائے تاریخ اور اصول کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔اس جواب میں پہلے مکی دور کی حکمت، پھر اجازت کے نزول کا مرحلہ اور اس کی شرائط و مقاصد بیان کیے جائیں گے اور پھر غزوہ تبوک کے پس منظر، تیاری، سفر، واقعات اور نتائج پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔واضح رہے کہ یہ تحریر خالصتاً تعلیمی و تاریخی ہے۔قرآنی آیات کا یہاں صرف مفہوم اور حوالہ دیا گیا ہے اور کسی معاصر مسئلے میں کسی عمل کی شرعی حیثیت کا فیصلہ کرنا اہلِ علم اور مجاز عدالتوں و اداروں کا کام ہے، اس گائیڈ کا نہیں۔طالب علم کو چاہیے کہ وہ اس موضوع کو اسی علمی دائرے میں پڑھے۔

مکی دور: صبر کی حکمت

مکہ کے تیرہ برسوں میں مسلمانوں کو سخت مظالم سہنے پڑے، مگر اس پورے دور میں قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔اس کی کئی حکمتیں سیرت نگار بیان کرتے ہیں۔پہلی یہ کہ مسلمانوں کی تعداد کم اور وہ منتشر تھے، لڑائی کی صورت میں نئی جماعت ختم ہو سکتی تھی۔دوسری یہ کہ اس دور کا اصل کام عقیدے کی تعمیر اور کردار کی تربیت تھا۔تیسری یہ کہ مکہ میں لڑائی کا مطلب اپنے ہی خاندانوں اور قبیلوں سے تصادم تھا جس سے دعوت کا پیغام جنگ کا پیغام بن کر رہ جاتا۔اس دور میں صبر، ہجرت اور پرامن دعوت ہی حکمتِ عملی رہی، جس کی سب سے بڑی مثال حبشہ کی طرف ہجرت اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت ہے۔یہاں سے ایک بنیادی اصول سمجھنا چاہیے کہ اسلام میں قتال ذاتی انتقام یا جذبات کا نام نہیں بلکہ مخصوص حالات میں ریاست کے فیصلے سے جڑا ہوا دفاعی عمل ہے۔نجی افراد یا گروہوں کو اپنی مرضی سے جنگ چھیڑنے کا کوئی اختیار اس تصور میں موجود نہیں، کیونکہ اس سے وہی انتشار پیدا ہوتا ہے جسے ریاست ختم کرنے کے لیے قائم ہوتی ہے۔

اجازت کا نزول اور اس کے مراحل

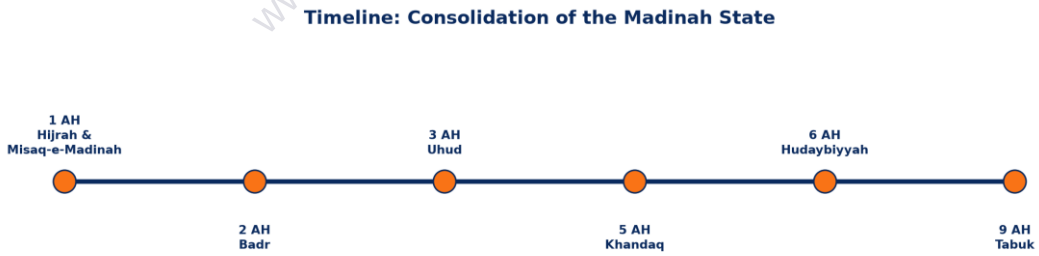
ہجرتِ مدینہ کے بعد حالات بدل گئے۔ اب مسلمانوں کی ایک ریاست قائم ہو چکی تھی، مہاجرین اپنے گھر اور مال سے محروم کیے جا چکے تھے اور قریش کی طرف سے مدینہ پر حملے کا خطرہ موجود تھا۔ ان حالات میں سیرت و تفسیر کے علماء کے مطابق قتال کی پہلی اجازت سورۃ الحج کی آیات انتالیس اور چالیس سے ملی، جن کے مفہوم میں ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دی گئی جن پر ظلم کیا گیا اور جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ اس مفہوم میں اجازت کی علت بھی خود واضح ہے، یعنی ظلم کا ہونا اور مظلوم کا اپنے دفاع کا حق۔ بعد میں سورۃ البقرہ کے مفاہیم میں اس اجازت کی حدود مزید واضح کی گئیں کہ جو تم سے لڑے اسی سے لڑو اور حد سے تجاوز نہ کرو، کیونکہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔ اسی طرح بعد کے مراحل میں ریاست کے دفاع اور معاہدہ شکن دشمن کے مقابلے کے احکامات آئے جن کا پس منظر ہمیشہ مخصوص واقعات سے جڑا تھا۔ علماء ان مراحل کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اجازت تدریجی تھی، پہلے صبر، پھر دفاع کی اجازت اور پھر ریاست کے خلاف جارحیت کرنے والوں کے مقابلے کا حکم۔ اس تدریج سے بھی یہی سبق ملتا ہے کہ یہ احکام وقتی جذبات نہیں بلکہ اصول، علت اور ذمہ دار قیادت سے جڑے ہوئے تھے۔

غزوہ تبوک کا پس منظر

غزوہ تبوک سن نو ہجری میں پیش آیا، جسے عام طور پر آخری بڑی مہم سمجھا جاتا ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ اطلاعات ملیں کہ بازنطینی یعنی رومی سلطنت شام کی سرحد پر مسلمانوں کے خلاف بڑی فوج جمع کر رہی ہے اور اس کے حلیف عرب قبائل بھی اس تیاری میں شریک ہیں۔ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد جزیرہ عرب کا بڑا حصہ مدینہ کی ریاست سے جڑ چکا تھا اور رومی طاقت کے لیے یہ تبدیلی تشویش کا باعث تھی۔ دوسری طرف موسم سخت گرمی کا تھا، مدینہ میں کھجوروں کی فصل تیار تھی اور سفر بہت لمبا یعنی تبوک تک تقریباً شمالی سرحد کا فاصلہ درپیش تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مہم کی تیاری کو خاص اہتمام سے کیا گیا اور اسے جیش العسرۃ یعنی تنگی کا لشکر کہا گیا، کیونکہ سواریوں اور سامان کی کمی شدید تھی اور بعض اوقات ایک اونٹ کئی افراد کے درمیان باری باری استعمال ہوا۔ اس پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ مہم کسی آسان سفر کا نام نہیں بلکہ سخت آزمائش تھی جس نے مخلص اور کمزور ایمان والوں کے درمیان فرق بھی واضح کر دیا۔

تیاری، سفر اور اہم واقعات

اس مہم کے لیے چندے اور تیاری میں صحابہ نے غیر معمولی ایثار دکھایا۔ سیرت کی روایات کے مفہوم کے مطابق حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بڑی تعداد میں اونٹ اور مالی وسائل پیش کیے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا اثاثہ لا کر رکھ دیا، جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی بڑا حصہ پیش کیا۔ کچھ صحابہ سواری نہ ملنے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے اور غم میں روتے رہے، جن کا ذکر قرآن مجید میں سورۃ التوبہ کے مفاہیم میں بھی آیا ہے، جبکہ منافقین نے گرمی اور فصل کا بہانہ بنا کر پیچھے رہنا اختیار کیا۔ روانگی سے پہلے مدینہ کی ذمہ داریاں منتخب صحابہ کے سپرد کی گئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہلِ خانہ کی دیکھ بھال کے لیے مدینہ میں ٹھہرایا گیا۔ سفر کے دوران لشکر حجر یعنی قومِ ثمود کے آثار والے علاقے سے گزرا جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کے پانی اور قیام کے بارے میں احتیاط کی ہدایت فرمائی اور عذاب والے مقامات سے سبق لینے کی تلقین کی۔ تبوک پہنچ کر لشکر نے تقریباً بیس دن قیام کیا مگر رومی فوج مقابلے پر نہ آئی۔ قیام کے دوران گرد و نواح کے بعض حکمرانوں اور قبائل نے آ کر صلح اور جزیے پر معاہدے کیے، جن میں ایلہ کے حکمران اور جرباء و اذرح کے لوگ خاص طور پر مذکور ہیں۔ اس طرح بغیر بڑی جنگ کے سرحدی خطے میں مدینہ کی ریاست کا اثر قائم ہو گیا۔



شکل: ریاستِ مدینہ کے دفاعی مراحل میں غزوہ تبوک کی حیثیت

واپسی اور اندرونی اثرات

واپسی پر مدینہ میں ان لوگوں کا معاملہ سامنے آیا جو بغیر عذر کے پیچھے رہ گئے تھے۔ تین مخلص صحابہ یعنی حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم کا واقعہ اس سفر کی سب سے مشہور داستانوں میں ہے، جنہوں نے بہانہ بنانے کے بجائے سچ بولا اور پھر طویل سماجی بائیکاٹ کی آزمائش برداشت کرنے کے بعد ان کی توبہ قبول

ہونے کا ذکر سورۃ التوبہ کے مفاہیم میں آیا ہے۔ یہ واقعہ سکھاتا ہے کہ سیرت میں غلطی کا علاج جھوٹ نہیں بلکہ سچائی اور توبہ ہے۔ واپسی کے راستے میں مسجدِ ضرار کا معاملہ بھی پیش آیا جو بظاہر عبادت گاہ مگر دراصل انتشار کا مرکز بنائی گئی تھی، اسے ختم کرنے کا حکم ہوا۔ اس سے اصول ملتا ہے کہ ریاست مذہبی آزادی دیتی ہے مگر عبادت کی آڑ میں فتنہ و سازش قبول نہیں کرتی۔ مدینہ واپسی پر مجموعی ماحول یہ تھا کہ ریاست کا وقار پہلے سے کہیں بڑھ چکا تھا اور عرب قبائل کے وفود کی آمد کا وہ سلسلہ تیز ہو گیا جو عام الوفود کہلاتا ہے۔

نتائج

غزوہ تبوک کے نتائج کئی جہتوں سے اہم ہیں۔ سیاسی نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی سرحد پر رومی اثر پسپا ہوا اور کئی سرحدی علاقے مدینہ سے معاہدے میں جڑ گئے، جس سے شام کی طرف ریاست کی سرحدیں محفوظ ہو گئیں۔ عسکری نتیجہ یہ تھا کہ اتنی بڑی فوج کی شمالی سمت پیش قدمی نے بازنطینی طاقت کو یہ پیغام دیا کہ مدینہ اب علاقائی طاقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور بڑی جنگ ٹل جانا بھی اسی دباؤ کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ داخلی نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی صفیں بے نقاب ہوئیں، سماج میں مخلص و منافق کی تمیز واضح ہو گئی۔ اخلاقی نتیجہ یہ تھا کہ ایثار، سچائی اور توبہ کی قدریں عملی مثالوں کے ساتھ امت کے سامنے آئیں۔ دعوتی نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے برس عرب بھر سے وفود آ کر اسلام سے آشنا ہوئے اور جزیرہ عرب کی وحدت کا عمل مکمل ہونے کے قریب پہنچا۔ مجموعی طور پر تبوک نے ثابت کیا کہ ریاست کی اصل طاقت تعداد سے زیادہ نظم، قیادت پر اعتماد اور مقصد کی اخلاقی بلندی میں ہوتی ہے۔

نتیجہ

اختتام پر خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو قتال کی اجازت مکی دور میں نہیں بلکہ ہجرت کے بعد اس وقت ملی جب ان پر ظلم ہو چکا تھا، وہ گھروں سے نکالے جا چکے تھے اور مدینہ کی ریاست کے دفاع کا سوال پیدا ہوا تھا، اور اس اجازت کے ساتھ حد سے تجاوز نہ کرنے کی قید بھی قرآن نے لگا دی۔ غزوہ تبوک اسی دفاعی پالیسی کی آخری بڑی مثال ہے جس میں بغیر بڑی خون ریزی کے سرحدیں محفوظ ہوئیں، معاہدے ہوئے اور ریاست کا وقار قائم ہوا۔ طالب علم کے لیے اس موضوع کا اصل سبق یہ ہے کہ وہ سیرت کے عسکری

ابواب کو اصول، پس منظر اور نتائج کے ساتھ پڑھے، کسی ایک واقعے کو سیاق سے کاٹ کر نہ سمجھے اور معاصر دنیا میں ان اصولوں کے اطلاق کے لیے ہمیشہ مستند علماء اور مجاز اداروں کی راہنمائی کو لازم سمجھے۔ یہی علمی رویہ سیرت کے مطالعے کو فتنے سے بچا کر ہدایت کا ذریعہ بناتا ہے۔

USMAN NOTES
www.usmannotes.com